باب پنجم

اسلامی انقلاب کے لیے مطلوبہ اوصاف

☆ انفرادی اوصاف

☆ اجتماعی اوصاف

☆ تکمیلی اوصاف

☆ وہ عیوب، جو ہر بھلائی کی بیخ کنی کر دیتے ہیں

☆ وہ نقائص، جن کی تاثیر کام کو بگاڑ دیتی ہے

اسلامی انقلاب کے لیے مطلوبہ اوصاف

اسلامی انقلاب کے لیے کن اوصاف سے آراستہ اور کن عیوب سے مبرا ہونا لازمی ہے۔[1]
آیندہ صفحات میں ہم اس مضمون کو حسب ذیل ترتیب کے ساتھ بیان کریں گے۔
۱- وہ اوصاف جو احیائے اسلام کے لیے کام کرنے والے ہر فرد میں بہ ذاتِ خود ہونے چاہئیں۔
۲- وہ اوصاف، جو ان کے اندر من حیث الجماعت ہونے چاہئیں۔
۳- وہ بڑی بڑی برائیاں، جن سے ان کو فرداً فرداً بھی اور من حیث الجماعت بھی پاک ہونا چاہیے۔

دنیا میں عملاً اسلامی نظامِ زندگی قائم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی مدد کے بعد دوسری اہم ترین چیز، جس پر کام یابی کا انحصار ہے وہ اس کام کی سعی کرنے والوں کے اپنے اوصاف ہیں۔ چند اوصاف ایسے ہیں، جو فرداً فرداً ان میں سے ہر ایک کی ذات میں ہونے چاہئیں۔ چند دوسرے اوصاف ان کے اندر اجتماعی طور پر پائے جانے چاہئیں۔ چند اور اوصاف اصلاح وتعمیر کی خدمت انجام دینے کے لیے ضروری ہیں۔ اور چند برائیاں ایسی ہیں، جن سے اگر وہ اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھیں تو ان کے سارے کیے دھرے پر پانی پھر سکتا ہے۔ ان امور کو سب سے پہلے ذہن نشین ہونا چاہیے تاکہ وہ تمام لوگ اس خدمت کا سچا جذبہ رکھتے ہیں مطلوب اوصاف اپنے اندر پرورش کرنے اور نا مطلوب سے اپنے آپ کو پاک کرنے کی طرف خاص طور سے متوجہ ہوں۔ تعمیرِ معاشرہ کے لیے تعمیر ذات شرطِ اوّل ہے کیوں کہ جو خود نہ سنورے وہ دوسروں کو سنوارنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔

---

(۱) مضامین کا یہ بیش قیمت سلسلہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے قلم سے ترجمان القرآن میں ۱۹۵۶ تا مارچ ۱۹۵۷ کے اشارات میں کئی قسطوں میں چھپ چکا ہے۔ یہ مضامین اسلامی تحریک کے کارکنوں کے لیے ایک سچی اور صحیح تصویر پیش کرتے ہیں، جن میں ہر شخص اپنا چہرہ بہ آسانی دیکھ سکتا ہے۔ (مرتب)

انفرادی اوصاف

اسلام کا صحیح فہم

انفرادی اوصاف میں سب سے پہلی چیز اسلام کا صحیح فہم ہے، جو آدمی اسلامی نظامِ زندگی کو برپا کرنا چاہتا ہو، اُسے پہلے خود اس چیز کو اچھی طرح جاننا اور سمجھنا چاہیے، جسے وہ برپا کرنا چاہتا ہے۔ اس غرض کے لیے اسلام کا محض اجمالی علم کافی نہیں ہے، بلکہ کم و بیش تفصیلی علم درکار ہے، اس غرض کے لیے اسلام کا محض اجمالی علم کافی نہیں ہے، بلکہ کم و بیش تفصیلی علم درکار ہے، اور اس کی کمی و بیشی آدمی کی استعداد پر موقوف ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس راہ کا ہر رہرو اور اس تحریک کا ہر کارکن مفتی یا مجتہد ہو۔ لیکن یہ بہر حال ضروری ہے کہ ان میں سے ہر ایک اسلامی عقائد کو جاہلی افکار و اوہام سے اور اسلامی طرزِ عمل کو جاہلیت کے طور طریقوں سے ممیّز کر کے جان لے، اور اس بات سے واقف ہو جائے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلام نے انسان کو کیا رہنمائی دی ہے۔ اس علم و واقفیت کے بغیر نہ آدمی خود صحیح راہ پر چل سکتا ہے، نہ دوسروں کو راستہ دکھا سکتا ہے۔ اور نہ تعمیر معاشرہ کے لیے کوئی کام صحیح خطوط پر کر سکتا ہے۔ عام کارکنوں کو یہ واقفیت اس حد تک ہونی چاہیے کہ وہ دیہاتی اور شہری عوام کو سیدھے سادھے طریقے سے دین سمجھا سکیں، لیکن عمدہ ذہنی صلاحیتیں رکھنے والے لوگوں کو اس میں اتنا درک بہم پہنچانا چاہیے کہ وہ ذہین طبقوں کو متاثر کر سکیں، تعلیم یافتہ لوگوں کے شکوک اور الجھنیں رفع کر سکیں، مخالفین کے اعتراضات کا مدلّل اور اطمینان بخش جواب دے سکیں، زندگی کے مختلف النوع مسائل کو اسلام کی روشنی میں حل کر سکیں۔

اسلامی نقطۂ نظر سے علوم وفنون کی تدوینِ جدید کرسکیں، اور اسلام کی ازلی وابدی بنیادوں پر ایک نئی تہذیب اور نئے تمدّن کی عمارت اُٹھا سکیں۔ ان میں اتنی تنقیدی صلاحیت ہونی چاہیے کہ موجودہ زمانے کے نظامِ فکر وعمل میں سے سقیم اجزا کو سلیم اجزا سے الگ کرسکیں، اور ساتھ ساتھ اتنی تعمیری صلاحیت بھی ہونی چاہیے کہ جو کچھ توڑنے کے لائق ہے، اُسے توڑ کر ایک بہتر چیز اس کی جگہ بنا سکیں اور جو کچھ رکھنے کے لائق ہے اُسے باقی رکھ کر ایک بہتر نظام میں اس کو استعمال کرسکیں۔

اسلام پر پختہ ایمان

علم ومعرفت کے بعد دوسرا ضروری وصف، جو اس مقصد کے لیے کام کرنے والوں میں ہونا چاہیے وہ یہ ہے کہ جس دین پر وہ نظامِ زندگی کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں وہ خود اس پر پختہ ایمان رکھتے ہوں، ان کا اپنا دل اس کے صحیح وبرحق ہونے پر مطمئن ہو اور ان کا اپنا ذہن اس معاملے میں پوری طرح یک سو ہو جائے۔ شک، تذبذب اور تردد لیے ہوئے کوئی شخص اس کام کو نہیں کرسکتا۔ دماغی الجھنیں اور نظر وفکر کی پراگندگیاں لے کر یہ کام نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی ایسا آدمی اس کام کے لیے موزوں نہیں ہوسکتا، جس کا دل ڈانوا ڈول ہو۔ جس کا ذہن یکسو نہ ہو اور جسے خیال وعمل کی مختلف راہیں اپنی طرف کھینچ رہی ہوں یا کھینچ سکتی ہوں۔ یہ کام تو جسے بھی کرنا ہو اُسے قطعی طور پر اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ خدا ہے اور انھی صفات سے متصف انھی اختیارات کا مالک، اور انھی حقوق کا مستحق ہے، جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔ آخرت ہے اور ٹھیک ٹھیک ویسی ہے جیسی قرآن میں بتائی گئی ہے۔ راہِ راست صرف ایک ہے اور وہ وہی ہے، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھائی ہے۔ ہر وہ چیز باطل ہے، جو اس کے خلاف ہو، یا اس سے موافقت نہ رکھتی ہو، جو خیال بھی کسی دوسرے نے پیش کیا ہے اور جو طریقہ بھی دوسرے نے نکالا ہے اس کو جانچنے کی کسوٹی صرف ایک ہے اور وہ ہے اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت۔ اس کسوٹی پر جو کھرا اترے وہ کھرا ہے، اور جو کھوٹا اُترے وہ کھوٹا ہے، اسلامی نظامِ زندگی کی تعمیر کے لیے ان حقیقتوں پر پختہ یقین درکار ہے۔ دل کا پورا اطمینان درکار ہے۔ دماغ کی کامل یکسوئی درکار ہے۔ جو لوگ اس معاملے میں ادنیٰ تذبذب بھی رکھتے ہوں، یا جن کی دل چسپیاں ابھی دوسری راہوں سے وابستہ ہوں۔ انھیں اس عمارت کے معمار بن کر آنے سے پہلے اپنی اس کم زوری کا علاج کرنا چاہیے۔

قول و عمل میں مطابقت

تیسرا لازمی وصف یہ ہے کہ آدمی کا عمل اس کے قول کے مطابق ہو۔ جس چیز کو وہ حق مانتا ہے اس کا اتباع کرے جس کو باطل قرار دیتا ہے اس سے اجتناب کرے، جسے اپنا دین کہتا ہے اسے اپنی سیرت و کردار کا دین بنائے اور جس چیز کی طرف وہ دنیا کو دعوت دیتا ہے سب سے پہلے خود اس کی پیروی اختیار کرے۔ اُسے اوامر کے اتباع اور نواہی سے اجتناب کے لیے کسی خارجی دباؤ یا اثر کا محتاج نہ ہونا چاہیے۔ صرف یہ چیز کہ ایک کام اللہ کی خوش نودی کا موجب ہے۔ اس بات کے لیے کافی ہونی چاہیے کہ وہ اس سے رُک جائے، اس کی یہ کیفیت صرف معمولی حالات ہی میں نہ ہونی چاہیے، بلکہ اس کی سیرت میں اتنی طاقت ہونی چاہیے کہ وہ غیر معمولی بگاڑ کے ماحول میں ہر خوف اور ہر لالچ کا مقابلہ کر کے اور ہر مزاحمت سے نبرد آزما ہو کر بھی راہِ راست پر ثابت قدم رہ سکے۔ جو لوگ اِس وصف سے خالی ہوں، وہ اصلاح و تعمیر میں مددگار تو ہو سکتے ہیں، مگر اس کے اصل کارکن نہیں ہو سکتے۔ اس کام میں مددگار تو ہر وہ شخص ہو سکتا ہے، جو اسلام کے لیے کوئی عقیدت اپنے اندر رکھتا ہے۔ بلکہ جو منکر اور مخالف مزاحم نہیں ہے وہ بھی ایک حد تک مددگار رہے۔ لیکن ایسے مددگار چاہے کروڑوں کی تعداد میں بھی موجود ہوں تو عملاً اسلامی نظام برپا نہیں ہو سکتا اور جاہلیت کے فروغ کی رفتار رک نہیں سکتی۔ عملاً یہ کام صرف اُسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اسے کرنے کے لیے ایسے لوگ اٹھیں، جو علم و یقین کی نعمت کے ساتھ سیرت و کردار کی طاقت بھی رکھتے ہوں اور جن کے ایمان و ضمیر میں اتنی زندگی موجود ہو کہ وہ کسی خارجی محرک کے بغیر خود اپنی اندرونی تحریک سے دین کے تقاضے پورے کرنے لگیں۔ اس طرح کے کارکن برسرِ کار آجائیں تو ان بہت سے ہمدردوں اور مددگاروں کی موجودگی بھی اپنا فائدہ دے سکتی ہے، جو مسلم معاشرے ہی میں نہیں، غیر مسلم معاشرے تک میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔

دین بہ حیثیت مقصد

ان تین صفات کے ساتھ ایک چوتھی صفت بھی اصلاح و تعمیر کے کارکنوں میں پائی جانی چاہیے، اور وہ یہ ہے کہ اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامتِ دین ان کے لیے محض ایک خواہش اور تمنا کا درجہ نہ رکھتی ہو بلکہ وہ اسے اپنی زندگی کا مقصد بنائیں۔ ایک قسم کے لوگ تو وہ ہوتے ہیں، جو

دین سے واقف ہوتے ہیں اور اس کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں مگر اس کو قائم کرنے کی سعی و جہد ان کا وظیفۂ زندگی نہیں ہوتا بلکہ وہ نیکی اور نیک عمل کے ساتھ اپنی دنیا کے معاملات میں لگے رہتے ہیں۔ یہ بلاشبہ صالح لوگ ہیں اور اگر اسلامی نظامِ زندگی عملاً قائم ہو چکا تو یہ اس کے اچھے شہری ہو سکتے ہیں، لیکن جہاں نظامِ جاہلیت پوری طرح چھایا ہوا اور کام یہ درپیش ہو کہ اُسے ہٹا کر نظامِ اسلام اس کی جگہ قائم کرنا ہے۔ وہاں صرف اِس درجے کے نیک لوگوں کی موجودگی سے کچھ نہیں بن سکتا وہاں ضرورت ان لوگوں کی ہوتی ہے، جن کے لیے یہ کام عین اُن کا مقصد زندگی ہو، وہ دنیا کے دوسرے کام تو جینے کے لیے کریں، مگر ان کا جینا صرف اس ایک مقصد کے لیے ہو، اس مقصد میں وہ مخلص ہوں، اس کی لگن ان کے دل کو لگی ہوئی ہے۔ اس کے حصول کی کوشش کا وہ پختہ عزم رکھتے ہوں۔ اس کام میں اپنا وقت، اپنا مال، اپنے جسم و جان کی قوتیں اور اپنے دل و دماغ کی صلاحیتیں کھپا دینے کے لیے وہ تیار ہوں، حتیٰ کہ اگر سر دھڑ کی بازی لگا دینے کی ضرورت پیش آ جائے تو وہ اس سے بھی منہ نہ موڑیں۔ جاہلیت کے جنگل کو کاٹ کر اسلام کی راہ ہموار کرنا ایسے ہی لوگوں کا کام ہے۔

یہ اوصاف: دین کا صحیح فہم، اس پر پختہ ایمان، اس کے مطابق سیرت و کردار اور اس کی اقامت کو مقصدِ زندگی بنانا۔ وہ بنیادی اوصاف ہیں، جو فرداً فرداً ان تمام لوگوں میں موجود ہونا چاہئیں، جو اسلامی نظام زندگی کی تعمیر کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہوں۔ ان کی اہمیت یہ ہے کہ اگر ان اوصاف کے حامل افراد بہم نہ پہنچیں تو اس کام کا سرے سے تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

اب یہ کہنے کی کوئی حاجت نہیں ہے کہ اس طرح کے افراد کا اگر وہ فی الواقع کچھ کرنا چاہتے ہوں، مل کر ایک جماعت کی صورت میں کام کرنا بہرحال ضروری ہے قطع نظر اِس کے کہ وہ کس جماعت میں ملیں اور کس نام سے کام کریں۔ ہر صاحبِ عقل آدمی اس بات کو خود جانتا ہے کہ اجتماعی نظام میں کوئی تغیر محض انفرادی کوششوں سے نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے بکھری ہوئی مساعی نہیں بلکہ سمٹی ہوئی مساعی درکار ہوتی ہے لہٰذا اسے ایک مسلّم حقیقت فرض کرتے ہوئے اب ہم ان اوصاف کو لیتے ہیں، جو اس طرح کی جماعت میں من حیث الجماعت پائے جانے چاہئیں۔

اجتماعی اوصاف

اخوت ومحبت

ایسی جماعت کا اوّلین وصف یہ ہونا چاہیے کہ اس کے شرکاء آپس میں محبت کرنے والے ہوں۔ ایک دوسرے کے ساتھ ایثار کا معاملہ کریں، جس طرح ایک عمارت اسی وقت مستحکم ہوتی ہے جب کہ اس کی اینٹیں باہم مضبوطی کے ساتھ پیوستہ ہوں اور اینٹوں کو جوڑنے والی چیز سیمنٹ ہے۔ اسی طرح ایک جماعت بھی اس وقت بنیان مرصوص بنتی ہے جب کہ اس کے ارکان کے دل ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوں اور دلوں کو جوڑنے والی چیز مخلصانہ محبت ہے۔ آپس کی خیرخواہی اور ہم دردی ہے، اور ایک دوسرے کے ساتھ ایثار کا معاملہ ہے، نفرت کرنے والے دل کبھی نہیں مل سکتے۔ منافقانہ میل جول کوئی حقیقی اتحاد پیدا نہیں کرسکتا۔ خودغرضانہ اتحاد نفاق کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور محض ایک روکھا سوکھا کاروباری تعلق کسی رفاقت کی بنیاد نہیں ہوسکتا، کوئی دنیاوی فرض ایسے بے جوڑ عناصر کو جمع بھی کردے تو وہ صرف بکھرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں اور پھر کچھ بنانے کے بہ جائے آپس ہی میں کٹ مرتے ہیں ایک مضبوط جماعت صرف اسی وقت وجود میں آتی ہے جب کہ اپنے خیالات میں مخلص اور اپنے مقصد سے محبت رکھنے والے لوگ باہم مجتمع ہوں اور پھر خیالات کا یہی اخلاص اور مقصد سے یہی محبت لے کے اندر آپس میں بھی اخلاص ومحبت پیدا کردے۔ اس طرح کی جماعت حقیقت میں ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوتی ہے۔ جس کے اندر ڈالنے کے لیے شیطان کوئی شگاف نہیں پاتا اور باہر سے مخالفتوں کے سیلاب اٹھا اٹھا کر لاتا بھی ہے تو اسے اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا۔

باہمی مشاورت

دوسرا ضروری وصف یہ ہے کہ اس جماعت کو باہمی مشورے سے کام کرنا چاہیے اور آداب مشاورت کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے۔ خود سر لوگوں کی جماعت، جس میں ہر شخص اپنی من مانی کرے، حقیقت میں کوئی جماعت نہیں ہوتی، بلکہ محض ایک منڈلی ہوتی ہے، جس سے کوئی کام بھی بن نہیں آسکتا اور وہ جماعت بھی زیادہ دیر تک نہیں چل سکتی، جس میں کوئی ایک شخص یا چند بااثر اشخاص کا ایک ٹولہ مختارِ کل بن جائے، باقی سب لوگوں کا کام اس کے اشاروں پر چلنا ہو۔ صحیح کام صرف مشاورت ہی سے ہوسکتا ہے کیوں کہ اس طرح نہ صرف یہ کہ بہت سے دماغ بحث و تمحیص سے ہر معاملے کے اچھے اور برے پہلوؤں کا جائزہ لے کر ایک بہتر نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ بلکہ اس سے دو فائدے اور بھی ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ جس کام میں پوری جماعت کا مشورہ بالواسطہ یا بلاواسطہ شامل ہو اسے پوری جماعت اطمینانِ قلب کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کرتی ہے اور کسی کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ ہم پر ایک چیز اوپر سے ٹھونس دی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ اِس طریقے سے پوری جماعت کو معاملہ فہمی کی تربیت ملتی ہے۔ ہر فرد جماعت اور اس کے معاملات سے دل چسپی لیتا ہے اور اس کے فیصلوں میں اپنی ذمے داری محسوس کرتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مشاورت کے ساتھ آدابِ مشاورت کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ آدابِ مشاورت یہ ہیں کہ ہر شخص ایمان داری کے ساتھ اپنی رائے پیش کرے اور کوئی بات دل میں چھپا کر نہ رکھے۔ بحث میں ضد، ہٹ دھرمی اور کسی قسم کے تعصب کا دخل نہ ہو اور جب کثرت رائے سے ایک فیصلہ ہو جائے تو اختلاف رکھنے والے چاہے اپنی رائے نہ بدلیں، مگر جماعتی فیصلے کو پوری خوش دلی کے ساتھ عمل میں لانے کی کوشش کریں۔ یہ تین باتیں اگر نہ ہوں تو مشاورت کے تمام فوائد ضائع ہو جاتے ہیں، بلکہ یہی چیز آخر کار جماعت میں پھوٹ ڈال دیتی ہے۔

نظم وضبط

تیسرا اہم وصف ہے نظم وضبط، باضابطگی، باقاعدگی، باہمی تعاون اور ٹیم کی طرح کام کرنا۔ ایک جماعت اپنی تمام خوبیوں کے باوجود صرف اس وجہ سے ناکام ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے فیصلوں اور منصوبوں کو عمل میں نہیں لاسکتی۔ اور یہ نتیجہ ہوتا ہے ضبط ونظم کی کمی اور تعاون کے فقدان کا۔ تخریبی کام محض ہلڑ سے بھی انجام پا سکتے ہیں، مگر کوئی پائیدار تعمیری کام منظّم سعی کے بغیر نہیں

ہوسکتا۔ منظّم سعی نام ہے اس چیز کا کہ جو ضابطہ تجویز کیا گیا ہو، پوری جماعت اس کی پابندی کرے۔ جماعت میں جس کو جس درجے میں بھی صاحب امر بنایا گیا ہو، اس کے احکام کی اطاعت کی جائے۔ جماعت کا ہر شخص فرض شناس ہو اور اپنے ذمہ کا کام ٹھیک وقت پر مستعدی کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کرے۔ جن کارکنوں کو جو کام مل کر کرنا ہو، وہ ایک دوسرے کے ساتھ پورا تعاون کریں۔ اور جماعت کی مشین اس قدر چست ہو کہ ایک فیصلہ ہوتے ہی اس کو عمل میں لانے کے لیے تمام پرزے حرکت میں آجائیں۔ دنیا میں اگر کوئی کام بنا سکتی ہیں تو ایسی ہی جماعتیں بنا سکتی ہیں۔ ورنہ ان جماعتوں کا عدم اور وجود برابر ہوتا ہے، جنھوں نے پرزے تو فراہم کر لیے ہوں مگر ان کے جوڑنے اور کس کر مشین کی طرح باقاعدہ چلانے کا کوئی انتظام نہ کیا ہو۔

تنقید بغرض اصلاح

آخری اور انتہائی اہم وصف یہ ہے کہ جماعت میں تنقید بغرض اصلاح کی روح بھی موجود ہو اور اس کا سلیقہ بھی پایا جاتا ہو۔ اندھے مقلدوں اور سادہ لوح معتقدوں کا گروہ خواہ کیسے ہی صحیح مقام سے کام کا آغاز کرے اور کیسے صحیح مقصد کو سامنے رکھ کر چلے، بہ ہر حال آخر کار بگڑتا چلا جاتا ہے۔ کیوں کہ انسانی کام میں کم زوریوں کا رونما ہونا فطرتاً ناگزیر ہے اور جہاں کم زوریوں پر نگاہ رکھنے والا کوئی نہ ہو، یا ان کی نشان دہی کرنا معیوب ہو، وہاں غفلت کی وجہ سے یا مجبورانہ سکوت کے باعث ہر کم زوری سکون و اطمینان کا آشیانہ پاتی چلی جاتی ہے اور انڈے بچے دینے لگتی ہے۔ جماعت کی صحت اور تندرستی کے لیے روحِ تنقید کے فقدان سے بڑھ کر کوئی چیز نقصان دہ نہیں، اور تنقیدی فکر کو دبانے سے بڑھ کر جماعت کے ساتھ کوئی اور بدخواہی نہیں ہوسکتی، یہی تو وہ چیز ہے، جس کے ذریعے سے خرابیاں بروقت سامنے آجاتی ہیں اور ان کی اصلاح کی سعی کی جاسکتی ہے۔ لیکن تنقید کے لیے شرط لازم یہ ہے کہ وہ عیب چینی کی نیت سے نہ ہو بلکہ اخلاص کے ساتھ اصلاح کی نیت سے ہو۔ اور اس کے ساتھ دوسری اتنی ہی ضروری شرط یہ ہے کہ تنقید کرنے والوں کو تنقید کا سلیقہ آتا ہو۔ ایک نیک نیت ناقد بھی بے ڈھنگی، بے موقع اور بھونڈی تنقید سے جماعت کو وہی نقصان پہنچا سکتا ہے، جو ایک عیب چیں اور بدنیت مفسد کے ہاتھوں پہنچنا ممکن ہے۔

تکمیلی اوصاف

اب تک یہ بتایا جا چکا ہے کہ معاشرے کی اصلاح اور اسلامی نظامِ زندگی کی تعمیر کا، جو کام اب درپیش ہے، اس کے لیے کن صفات کے حامل افراد درکار ہیں اور ان افراد کی اجتماعی تنظیم میں کن اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے۔

اس سلسلے میں اب تک جن امور کا ذکر کیا گیا ہے ان کی حیثیت دراصل محض ابتدائی اور بنیادی اوصاف کی ہے۔ جس طرح ایک کاروبار کی ابتدا کرنے کے لیے ایک کم سے کم سرمایہ دار درکار ہوتا ہے، جس کے بغیر اسے شروع ہی نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح اس کام کے لیے یہ کم سے کم اخلاقی سرمایہ ہے، جو آغازِ کار ہی میں موجود ہونا چاہیے، ورنہ اس کا حوصلہ کرنا ہی فضول ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے افراد کے ہاتھوں کسی اسلامی نظام کے قیام کا خیال بھی نہیں کیا جاسکتا، جو اسلام کو جانتے ہی نہ ہوں، یا اس کے بارے میں خود اپنے اندر ہی قلبی اطمینان اور ذہنی یک سوئی نہ رکھتے ہوں یا اس کو خود اپنے اخلاق و کردار اور اپنی عملی زندگی کا دین بنانے سے قاصر ہوں، یا اس کے قیام کی سعی کو انھوں نے اپنا مقصود ہی نہ ٹھیرایا ہو۔ اسی طرح یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر مطلوبہ اوصاف کے افراد جمع تو ہو جائیں، مگر ان کے دل باہم جڑے ہوئے نہ ہوں، ان میں تعاون اور نظم و ضبط نہ ہو، ان کو مل کر کام کرنے کا ڈھنگ نہ آتا ہو اور وہ باہمی مشورہ و تنقید کے صحیح طریقوں سے نابلد ہوں، تو محض ان کا جمع ہو جانا کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں کرسکتا۔ لہٰذا یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ وہ چار انفرادی اور چار اجتماعی اوصاف، جن کا ذکر ہم نے اب تک کیا ہے۔ درحقیقت اس کام کا سرمایۂ آغاز ہیں اور ان کی جو کچھ بھی اہمیت ہے اسی لحاظ سے ہے۔ لیکن یہ خیال کرنا صحیح نہیں

ہے کہ اس کام کے فروغ اور اس کی کام یابی کے لیے بس یہی اخلاقی اور رُوحانی سرمایہ کافی ہے۔
اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ مزید اوصاف کون سے ہیں، جو اصلاح وتعمیر کے مقصد میں کام یاب ہونے کے لیے ضروری ہیں۔

تعلق باللہ اور خلوص

ان میں اوّلین وصف تعلق باللہ اور اخلاص للہ ہے۔ دنیا کے دوسرے کام تو نفس یا خاندان یا قبیلے یا قوم و وطن کی خاطر کیے جاسکتے ہیں، ذاتی اغراض اور مادّی مقاصد کی ساری آلائشوں کے ساتھ کیے جاسکتے ہیں، خدا پرستی ہی نہیں، انکارِ خدا تک کے ساتھ کیے جاسکتے ہیں، اور ان میں ہر طرح کی دنیاوی کام یابیاں ممکن ہیں۔ لیکن اسلامی نظامِ زندگی کا برپا کرنا ایک ایسا کام، جس میں کوئی کام یابی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک آدمی کا تعلق اللہ کے ساتھ صحیح، مضبوط اور گہرا نہ ہو، اور اس کی نیت خالصتاً اللہ ہی کے لیے کام کرنے کی نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں جس چیز کو آدمی قائم کرنا چاہتا ہے وہ اللہ کا دین ہے اور اسے قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی سب کچھ اس خدا کے لیے کرے جس کا یہ دین ہے۔ اسی کی رضا اس کام میں مطلوب ہونی چاہیے، اسی کی محبت اس کے لیے واحد محرک ہونی چاہیے۔ اسی کی تائید ونصرت پر کلّی اعتماد ہونا چاہیے۔ اسی سے اجر کی ساری امیدیں وابستہ ہونی چاہئیں۔ اسی کی ہدایات اور اسی کے امر و نہی کا اتباع ہونا چاہیے اور اسی کی پکڑ کا خوف دل پر چھایا رہنا چاہیے۔ اس کے سوا جس خوف، جس لالچ اور جس محبت اور جس اتباع و اطاعت کی آمیزش بھی ہوگی اور جو دوسری غرض بھی اس کام میں شامل ہوجائے گی۔ وہ راہِ راست سے قدم ہٹا دے گی اور اس کے نتیجے میں اور جو کچھ بھی قائم ہوجائے بہ ہر حال اللہ کا دین قائم نہ ہوسکے گا۔

فکرِ آخرت

اسی سے قریب تر تعلق رکھنے والا دوسرا وصف فکرِ آخرت ہے۔ مومن کے کام کرنے کی جگہ اگرچہ دنیا ہے اور جو کچھ اسے کرنا ہے یہیں کرنا ہے، مگر وہ کام اس دنیا کے لیے نہیں کرتا بلکہ آخرت کے لیے کرتا ہے اور اس کا مطمعِ نظر دنیاوی نتائج نہیں بلکہ اُخروی نتائج ہوتے ہیں۔ اسے

ہر لحاظ سے وہ کام کرنا چاہیے، جو آخرت میں نافع ہے اور ہر اس مشغلے سے دست کش ہو جانا چاہیے، جس کا وہاں کوئی حاصل نہیں نکلنا ہے۔ اُسے ہر اس فائدے کو ٹھکرا دینا چاہیے، جو آخرت میں نقصان کا موجب ہو اور ہر اس نقصان کو انگیز کر لینا چاہیے، جو آخرت میں نفع بخش ہو، اسے فکر صرف آخرت کے عذاب وثواب کی ہونی چاہیے۔ دنیا کے کسی عذاب وثواب کی کوئی اہمیت اس کی نگاہ میں نہ ہونی چاہیے۔ اس کی کوششیں اس دنیا میں بار آور ہوں یا نہ ہوں، یہاں اس کی کام یابی ہوتی نظر آئے یا ناکامی، یہاں اس کی تعریف ہو یا ندامت، یہاں وہ انعام پائے یا آزمائشوں میں ڈالا جائے۔ ہر حال میں اس کو اِس یقین کے ساتھ کام کرنا چاہیے، جس خدا کے لیے وہ یہ ساری محنتیں کر رہا ہے، اس کی نگاہ سے کچھ پوشیدہ نہیں ہے، اور اس کے ہاں دارِ آخرت کی ابدی جزا سے وہ ہرگز محروم نہ رہے گا، اور وہیں کی کام یابی اصلی کام یابی ہے۔ اِس ذہنیت کے بغیر آدمی کے لیے چند قدم بھی اِس راہ میں صحیح رُخ پر چلنا ممکن نہیں ہے۔ دنیا کی مقصودیت کا لگاؤ کسی ادنیٰ درجے میں بھی اس کے ساتھ لگا رہ جائے تو وہ قدم میں لغزش پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ راہِ خدا میں ایک چوٹ تو نہیں دو چار چوٹیں آخر کار اس شخص کی ہمتیں توڑ دیتی ہیں، جو دنیاوی کام یابیوں کو مقصود بنا کر چلتا ہے اور اس کی کوئی کام یابی کسی نہ کسی مرحلے پر اس آدمی کے رویّے میں بگاڑ پیدا کر دیتی ہے، جس کے دل کو دنیاوی مقاصد کی کوئی چاٹ نہ لگی ہو۔

حسنِ سیرت

ان دو اوصاف کی تاثیر کو، جو چیز عملاً ایک زبردست قوتِ تسخیر میں تبدیل کر دیتی ہے وہ حسنِ سیرت ہے۔ خدا کی راہ میں کام کرنے والے لوگوں کو عالی ظرف اور فراخ حوصلہ ہونا چاہیے۔ ہم دردِ خلائق اور خیر خواہِ انسانیت ہونا چاہیے اور کریم النّفس اور شریف الطبع ہونا چاہیے، خود دار اور خوگرِ قناعت ہونا چاہیے۔ متواضع اور منکسر المزاج ہونا چاہیے۔ شیریں کلام اور نرم خو ہونا چاہیے۔ وہ ایسے لوگ ہونے چاہئیں، جن سے کسی کو شر کا اندیشہ نہ ہو اور ہر ایک ان سے خیر خواہی کا متوقع ہو، جو اپنے حق سے کم پر راضی ہوں اور دوسروں کو ان کے حق سے زیادہ دینے پر تیار ہوں، جو برائی کا جواب بھلائی سے دیں یا کم سے کم برائی سے نہ دیں۔ جو اپنے عیوب کے معترف اور دوسروں کی بھلائی کے قدر داں ہوں، جو اتنا بڑا دل رکھتے ہوں کہ لوگوں کی کم زوریوں سے

چشم پوشی کر سکیں، قصوروں کو معاف کر سکیں، زیادتیوں سے درگزر کر سکیں، اور اپنی ذات کے لیے کسی کا انتقام نہ لیں۔ جو خدمت لے کر نہیں، خدمت کر کے خوش ہوتے ہوں، اپنی غرض کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کی بھلائی کے لیے کام کریں، ہر تعریف سے بے نیاز اور ہر مذمت سے بے پرواہ ہو کر وہ اپنا فرض انجام دیں اور خدا کے سوا کسی کے اجر پر نگاہ نہ رکھیں، جو طاقت سے دبائے نہ جا سکیں، دولت سے خریدے نہ جا سکیں، مگر حق اور راستی کے آگے بے تامّل سر جھکا دیں، جن کے دشمن بھی ان پر بھروسا رکھتے ہوں کہ کسی حال میں ان سے شرافت اور انصاف کے خلاف کوئی حرکت سرزد نہیں ہو سکتی۔ یہ دلوں کو موہ لینے والے اخلاق ہیں۔ ان کی کاٹ تلوار کی کاٹ سے بڑھ کر اور ان کا سرمایہ سیم و زر کی دولت سے گراں تر ہے۔ کسی فرد کو یہ اخلاق میسر ہوں تو وہ اپنے گرد و پیش کی آبادی کو مسخّر کر لیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی جماعت کی جماعت ان اوصاف سے متصف ہو، اور پھر وہ کسی مقصدِ عظیم کے لیے منظّم سعی بھی کر رہی ہو تو ملک کے ملک اس کے آگے مسخّر ہوتے چلے جاتے ہیں، حتیٰ کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کو شکست دینے میں کام یاب نہیں ہو سکتی۔

صبر و استقامت

اس کے ساتھ ایک اور صفت بھی ہے، جسے کام یابی کی کلید کہنا چاہیے، اور وہ ہے صبر، یہ ایک وسیع لفظ ہے، جس کے بہت سے مفہومات ہیں اور راہِ خدا میں کام کرنے والوں کو ان میں سے ہر مفہوم کے لحاظ سے صابر ہونا چاہیے۔

صبر کا ایک مفہوم یہ ہے کہ آدمی جلد باز نہ ہو، اپنی کوششوں کے نتائج فوراً اور جلدی دیکھنے کے لیے بے تاب نہ ہو اور دیر لگتے دیکھ کر ہمت نہ ہار جائے۔ صابر آدمی کی خوبی یہ ہے کہ وہ تمام عمر ایک مقصد کے پیچھے مسلسل محنت کیے چلا جاتا ہے، اور پیہم ناکامیوں کے باوجود اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ اصلاحِ خلق اور تعمیرِ حیات کا کام ایسا صبر آزما ہے کہ اس صفت کے بغیر کوئی شخص اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ یہ بہ ہر حال ہتھیلی پر سرسوں جمانا نہیں ہے۔

صبر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ آدمی تلوّن مزاجی، ضعفِ رائے اور قلتِ عزم کی بیماری میں مبتلا نہ ہو۔ اس میں یہ صفت موجود ہو کہ جس راہ کو اس نے سوچ سمجھ کر اختیار کر لیا ہے اس پر ثابت قدم رہے اور دل کے پورے عزم و ارادے کی پوری قوت کے ساتھ اس پر بڑھتا چلا جائے۔

صبر ہی کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ آدمی مشکلات اور مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرے اور اپنے مقصد کی راہ میں جو تکلیف بھی پیش آجائے اسے ٹھنڈے دل کے ساتھ برداشت کرلے۔ صابر آدمی کسی طوفان اور کسی سیلاب کے تھپیڑوں سے شکست خوردہ ہوکر منھ نہیں موڑتا۔

صبر کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ آدمی زودرنج اور مشتعل مزاج نہ ہو۔ بلکہ متحمل اور بردبار ہو، جس شخص کو اصلاح وتعمیر کا کام کرنا ہو اور جسے تعمیر کے لیے کچھ نہ کچھ ناگزیر تخریب بھی کرنی پڑے، خصوصیت کے ساتھ جب یہ خدمت اسے مدتوں کی بگڑی ہوئی سوسائٹی میں انجام دینی ہو اسے لامحالہ بڑی گندی اور گھناؤنی اور کینہ قسم کی مخالفتوں سے سابقہ پیش آکر رہتا ہے۔ اگر وہ اتنی طاقت نہیں رکھتا کہ گالیاں کھاکر ہنس دے، طعنے سن کر ٹال دے، الزام اور بہتان اور جھوٹے پروپیگنڈے کو یکسر نظرانداز کرکے پورے سکون اور جمعیت خاطر کے ساتھ اپنا کام کرتا رہے تو بہتر یہی ہے کہ وہ اس راہ میں قدم ہی نہ رکھے۔ اس لیے کہ یہ کانٹوں بھری راہ ہے، اس کا ہر کانٹا یہ عزم کیے بیٹھا ہے کہ آدمی اور جس طرف بھی چلا جائے، مگر اس سمت میں اسے ایک انچ بھی نہ بڑھنے دیا جائے گا۔ اس حالت میں جو شخص ہر کانٹے سے الجھنے لگے، وہ کیا پیش قدمی کرے گا۔ یہاں تو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے، جن کے دامن سے اگر کوئی کانٹا الجھ جائے تو وہ دامن کا وہ حصہ پھاڑ کر اس کے حوالے کردیں اور ایک لمحے کے لیے بھی اپنی راہ کھوٹی نہ کریں۔ یہ صبر صرف مخالفوں ہی کے مقابلے میں درکار نہیں ہے بلکہ بسا اوقات اس راہ کے راہرو کو، خود اپنے ساتھیوں سے تلخ اور ناگوار باتوں سے سابقہ پیش آجاتا ہے اور ان کے معاملے میں اگر وہ حلم وتحمل سے کام نہ لے تو پورے قافلے کی راہ مار سکتا ہے۔

صبر اس چیز کا نام بھی ہے کہ آدمی ہر خوف اور ہر لالچ کے مقابلے میں راہِ راست پر جما رہے، شیطان کی ساری ترغیبات اور نفس کی تمام خواہشات کے علی الرغم اپنا فرض بجالائے۔ حرام سے پرہیز کرے اور حدود اللہ پر قائم رہے۔ گناہ کی ساری لذتوں اور منفعتوں کو ٹھکرادے اور نیکی اور راستی کے ہر نقصان اور اس کی بہ دولت حاصل ہونے والی ہر محرومی کو انگیز کرجائے۔ اپنی آنکھوں سے دنیا پرستوں کی رونقِ حیات دیکھے اور اس پر ریجھنا تو درکنار، دل میں ادنیٰ سی حسرت کو بھی راہ نہ دے۔ اپنے سامنے دنیا طلبی کی راہیں کشادہ اور کامرانیوں کے مواقع موجود پائے اور دل کی پوری طمانیت کے ساتھ اس متاعِ حیات پر راضی رہے، جو اپنے مقصد کی خدمت کرتے ہوئے وہ اپنے رب کے فضل سے حاصل کررہا ہو۔

صبر ان تمام معنوں میں کلیدِ کام یابی ہے، جس پہلو سے بھی ہمارے کام میں بے صبری کا دخل ہوگا، اس کا برا نتیجہ ظاہر ہو کر رہے گا۔

حکمت

ان سب اوصاف کے ساتھ ایک نہایت اہم وصف حکمت ہے، جس پر بہت بڑی حد تک کام یابی کا انحصار ہے۔ دنیا میں جو نظامِ زندگی بھی قائم ہیں۔ ان کو اعلیٰ درجے کے ذہین اور ہوشیار لوگ چلا رہے ہیں اور ان کی پشت پر مادی وسائل کے ساتھ عقلی وفکری طاقتیں اور علمی وفنی قوتیں کام کر رہی ہیں۔ ان کے مقابلے میں ایک دوسرے نظام کو قائم کر دینا اور کام یابی کے ساتھ چلا لینا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ بسم اللہ کے گنبد میں رہنے والوں کے کرنے کا کام نہیں ہے۔ سادہ لوح لوگ خواہ کتنے ہی نیک اور نیک نیت ہوں، اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ اس کے لیے گہری بصیرت اور تدبّر کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے دانش مندی اور معاملہ فہمی درکار ہے۔ اس کام کو وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو موقع شناس اور با تدبیر ہوں اور ان کی زندگی کے مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ حکمت ان سب اوصاف کے لیے ایک جامع لفظ ہے اور اس کا اطلاق دانائی وزیرکی کے متعدد مظاہر پر ہوتا ہے۔

یہ حکمت ہے کہ آدمی انسانی نفسیات کی سمجھ رکھتا ہو اور انسانوں سے معاملہ کرنا جانتا ہو۔ لوگوں کے اذہان کو اپنی دعوت سے متاثر کرنے اور ان کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کے طریقوں سے واقف ہو۔ ہر شخص کو ایک ہی لگی بندھی دوا دیتا نہ چلا جائے بلکہ ہر ایک کے مزاج اور مرض کی تشخیص کر کے علاج کرے۔ سب کو ایک لکڑی سے نہ ہانکے بلکہ جن جن اشخاص اور طبقوں اور گروہوں سے اس کو سابقہ پیش آئے ان کے مخصوص حالات کو سمجھ کر ان کے ساتھ معاملہ کرے۔

یہ بھی حکمت ہے کہ آدمی اپنے کام کو اس کے کرنے کے طریقوں کو جانتا ہو اور اس کے راستے میں پیش آنے والی دشواریوں، مخالفتوں اور مزاحمتوں سے نمٹنا بھی اس کو آتا ہو۔ اسے ٹھیک ٹھیک معلوم ہونا چاہیے کہ جس مقصد کے لیے وہ سعی کرنے اٹھا ہے اس کے لیے اسے کیا کچھ کرنا ہے، کس کس طرح دور کرنا ہے اور کس کس قسم کی رکاوٹوں کو دور کرنا ہے۔

یہ بھی حکمت ہی ہے کہ آدمی اس وقت کے حالات پر نظر رکھتا ہو، مواقع کو سمجھتا ہو اور یہ جانتا ہو کہ کس موقع پر کیا تدبیر کی جانی چاہیے حالات کو سمجھے بغیر اندھا دھند قدم اٹھا دینا، بے موقع

کام کرنا اور موقعے پر چوک جانا مغفل لوگوں کا کام ہے اور ایسے لوگ خواہ کتنے ہی پاکیزہ مقصد کے لیے کتنی ہی نیکی اور نیک نیتی کے ساتھ کام کر رہے ہوں، کبھی کام یاب نہیں ہو سکتے۔

اور ان سب حکمتوں سے بڑھ کر راس الحکمت یہ ہے کہ آدمی دین میں تفقہ اور معاملاتِ دنیا میں بصیرت رکھتا ہو۔ محض احکام اور مسائلِ شریعت سے واقف ہونا اور انھیں پیش آمدہ حوادث پر چسپاں کر دینا منصبِ افتاء کے لیے تو کافی ہوسکتا ہے۔ مگر بگڑے ہوئے معاشرے کو درست کرنے اور نظامِ زندگی کو جاہلیت کی بنیادوں سے اکھاڑ کر از سرِ نو قائم کرنے کے لیے کافی نہیں ہوسکتا۔ اس مقصد کے لیے تو ضروری ہے کہ آدمی جزیاتِ احکام کے ساتھ کلّیاتِ احکام، بلکہ پورے نظامِ دین پر نظر رکھتا ہو، پھر احکام کے ساتھ ان کی حکمت کا بھی اسے علم ہو اور وقت کے ان حالات و مسائل کو بھی وہ سمجھتا ہو، جن میں احکام کو رائج کرنا مطلوب ہو۔

مطلوبہ اوصاف کے اس مرقع کو دیکھ کر بادی النظر میں ایک آدمی ہول کھا جاتا ہے اور یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ یہ کام تو پھر کاملین کے کرنے کا ہے۔ عام انسان کہاں سے اتنے وصف لے کر آسکتے ہیں۔ اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ہر صفت کا ہر شخص میں بہ درجہ کمال پایا جانا لازم نہیں ہے۔ اور نہ یہی لازم ہے کہ کسی میں وہ پہلے ہی قدم پر اپنی پوری تربیت یافتہ شکل میں موجود ہو۔ ہمارا مقصود ان باتوں کے بیان کرنے سے صرف یہ بات ذہن نشین کرنا ہے کہ جو لوگ اس کام کو کرنے کے لیے اٹھیں وہ محض ''خدمتِ قوم کا ایک کام'' سمجھ کر یونہی کھڑے نہ ہو جائیں بلکہ اپنے نفس کا جائزہ لے کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ اس کام کے لیے جو اوصاف مطلوب ہیں ان کا مادہ ان کے اندر موجود ہے یا نہیں۔ بس مادہ اگر موجود ہے تو آغازِ کار کے لیے کافی ہے۔ اس کو پرورش کرنا اور اپنی استعداد کے مطابق زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک ترقی دینا بعد کے مراحل سے تعلق رکھتا ہو۔ جس طرح ایک ذرا سا بیج زمین میں جڑ پکڑنے کے بعد، آہستہ آہستہ غذا پا کر تناور درخت بن جاتا ہے۔ لیکن بیج ہی موجود نہ ہو تو کچھ بھی نہیں بن سکتا۔ اسی طرح صفاتِ مطلوبہ کا مادّہ آدمی میں موجود نہ ہو تو مناسب سعی و کوشش سے وہ بہ تدریج کمال تک پہنچ سکتا ہے۔ مگر سرے سے مادہ موجود ہی نہ ہو تو کسی سعی اور تربیت سے اس کا پیدا ہو جانا ممکن نہیں ہے۔

جو کچھ اب تک کہا جا چکا ہے۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ اصلاح و تعمیر کے لیے ایک صحیح

لائحہ عمل جتنا ضروری ہے۔اس سے بہت زیادہ ضروری ایسے کارکنوں کا وجود ہے، جو اس کام کے لیے موزوں اخلاقی اوصاف رکھتے ہوں کیوں کہ آخر کار جس چیز کو معاشرے سے نبرد آزما اور اقامتِ دین کی آزمائشوں سے دوچار ہونا ہے وہ کسی لائحۂ عمل کی دفعات نہیں بلکہ ان لوگوں کی اجتماعی وانفرادی سیرت ہے، جو میدانِ عمل میں کام کرنے کے لیے آگے بڑھیں۔اس لیے ہمیں کسی لائحۂ عمل اور پروگرام کو طے کرنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کام کے لیے کیسے کارکن درکار ہیں۔ان کو کن اوصاف سے متصف اور کن برائیوں سے پاک ہونا چاہیے اور ایسے کارکنوں کی تیاری کے ذرائع کیا ہیں۔اس حقیقت کو واضح کرنے کے بعد ہم نے اوصافِ مطلوبہ کو تین حصوں میں بیان کیا ہے۔

اوّلاً وہ اوصاف، جو بنیادِ کار کی حیثیت سے اس کام میں حصہ لینے والے ہر فرد کے اندر موجود ہونی چاہئیں اور وہ یہ ہیں (۱) دین کا صحیح فہم (۲) اس پر پختہ ایمان (۳) اس کے مطابق سیرت و کردار اور (۴) اس کی اقامت کو مقصدِ زندگی بنانا۔ثانیاً وہ اوصاف ہیں، جو اس خدمت کے لیے اٹھنے والی جماعت میں پائے جانے چاہئیں اور وہ یہ ہیں (۱) باہمی محبت، حسنِ ظن، اخلاص، ہمدردی و خیر خواہی اور ایک دوسرے کے لیے ایثار (۲) آپس کے مشورے سے کام کرنا اور مشاورت کے اسلامی آداب کو ملحوظ رکھنا (۳) نظم وضبط و باقاعدگی، تعاون اور ٹیم اسپرٹ۔تنقید بغرضِ اصلاح، جو سلیقے اور معقول طریقے سے ہو، جس سے جماعت کے اندر رونما ہونے والی خامیوں کا ہر وقت تدارک ہو سکے، نہ کہ خرابیوں میں اُلٹا اضافہ ہو۔

ثالثاً وہ اوصاف، جو اقامتِ دین کی جدوجہد کو صحیح خطوط پر چلانے اور کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لیے ناگزیر ہیں یعنی (۱) اللہ کے ساتھ گہرا تعلق اور اسی کی رضا کے لیے کام کرنا (۲) آخرت کی باز پرس کو یاد رکھنا اور اجرِ آخرت کے سوا کسی دوسری چیز پر نگاہ نہ رکھنا (۳) حسنِ اخلاق (۴) صبر (۵) حکمت۔

اب ہمیں یہ دکھانا ہے کہ وہ بڑی بڑی برائیاں کیا ہیں، جن سے اس مقصدِ عظیم کے خادموں کو پاک ہونا چاہیے۔

وہ عیوب جو ہر بھلائی کی بیخ کنی کر دیتے ہیں

کبر وغُرور

اولین اور بدترین عیب، جو ہر بھلائی کی جڑ کاٹ دیتا ہے کبر وفخر، غرور، خود پسندی اور تعلّی ہے۔ یہ ایک سراسر شیطانی جذبہ ہے، جو شیطانی کاموں کے لیے ہی موزوں ہوسکتا ہے۔ خیر کا کوئی کام اس کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ بڑائی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ بندوں میں بڑائی کا گھمنڈ ایک جھوٹ کے سوا کچھ نہیں۔ جو شخص یا گروہ اس جھوٹے پندار میں مبتلا ہو وہ اللہ تعالیٰ کی ہر تائید سے محروم ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اللہ کو سب سے بڑھ کر یہی چیز اپنی مخلوق میں ناپسند ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس مرض کے مریض کو کبھی راہ راست کی طرف ہدایت نہیں ملتی۔ وہ پے در پے جہالتوں اور حماقتوں کا ارتکاب کرتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر کار ناکامی کا منہ دیکھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ خلقِ خدا کے ساتھ برتاؤ میں اس سے تکبّر کا جتنا جتنا اظہار ہوتا جاتا ہے اتنی ہی اس کے خلاف نفرت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ مبغوضِ خلائق ہو کر وہ اس قابل ہی نہیں رہتا کہ اس کا کوئی اخلاقی اثر لوگوں میں قائم ہو سکے۔

خیر کے لیے کام کرنے والوں میں یہ بیماری کئی راہوں سے آتی ہے۔ کم ظرف لوگوں میں یہ اس راہ سے آتی ہے کہ جب ان کی دینی واخلاقی حالت گرد وپیش کے معاشرے کی بہ نسبت کسی حد تک بہتر ہو جاتی ہے اور کچھ قابلِ خدمات بھی وہ بجالاتے ہیں، جن کا اعتراف دوسروں کی زبانوں سے ہونے لگتا ہے تو شیطان ان کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالنا شروع کر دیتا ہے کہ اب تم واقعی بڑی چیز ہو گئے ہو اور شیطان ہی کی اکساہٹ سے وہ اپنی زبان اور اپنے طرزِ عمل سے

جتانے پر اتر آتے ہیں۔ اس طرح وہ کام جس کا آغاز نیکی کے جذبے سے ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ ایک نہایت ہی غلط راہ پر چل پڑتا ہے۔ دوسرا راستہ اس کے آنے کا یہ ہے کہ جو لوگ نیک نیتی کے ساتھ ایک طرف اپنی اور دوسری طرف خلقِ خدا کی اصلاح کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ ان کے اندر لامحالہ کچھ بھلائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور یہ کسی نہ کسی حد تک اپنے معاشرے کی عام حالت سے ممتاز ہوتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ ان کی خدمات قابلِ قدر ہوتی ہیں اور یہ ایسے امور ہیں، جو بہ ہر حال محسوس ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ یہ امر واقعہ کا احساس بہ جائے خود فطری اور ناگزیر ہے۔ مگر نفس کی ایک ذرا سی اُکساہٹ اسے تکبّر اور خود پسندی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ پھر بسا اوقات ایسی صورتیں پیش آتی ہیں کہ جب ان کے مخالفین ان کے کام اور کام سے گزر کر ان کی ذات میں کیڑے ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں تو اپنی مدافعت میں چند باتیں کہنی پڑتی ہیں، جو چاہے بیان واقعی ہوں مگر اپنے محاسن کے اظہار سے خالی نہیں ہوتیں۔ اس چیز کو ایک ذرا سی بے اعتدالی جائز حد سے بڑھا کر تفاخر کے حدود میں پہنچا دیتی ہے۔ یہ ایک خطرناک چیز ہے۔

احساسِ بندگی

جس سے ہر فرد اور جماعت کو خبردار رہنا چاہیے جو خلوص کے ساتھ اصلاح کا مقصد لے کر اُٹھے۔ بلکہ ایسے ہر شخص میں فرداً فرداً اور ایسی ہر جماعت میں مجمعاً عبدیت کا احساس نہ صرف موجود بلکہ زندہ اور تازہ رہنا چاہیے کہ کبریائی صرف خدا کی ذات کے لیے مخصوص ہے۔ بندے کا مقام عجز و نیاز کے سوا اور کچھ نہیں۔ کسی بندے میں اگر فی الواقع کوئی بھلائی پیدا ہو تو یہ اللہ کا فضل ہے۔ فخر کا نہیں، شکر کا مقام ہے اس پر اللہ کے حضور اور زیادہ عاجزی پیش کرنی چاہیے اور اس تھوڑی سی پونجی کو خیر کی خدمت میں لگا دینا چاہیے تاکہ اللہ مزید فضل سے نوازے اور یہ پونجی ترقی کرے۔ بھلائی پا کر غرورِ نفس میں مبتلا ہونا تو دراصل اسے برائی سے بدل لینا چاہیے اور یہ ترقی کا نہیں بلکہ تنزّل کا راستہ ہے۔

بندگی و عاجزی کے احساس کے بعد دوسری چیز، جو انسان کو تکبّر کے رجحانات سے بچا سکتی ہے وہ محاسبۂ نفس ہے۔ جو شخص اپنا ٹھیک ٹھیک حساب لگائے اور اپنی خوبیوں کو محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھے کہ وہ کن کم زوریوں اور خامیوں اور کوتاہیوں میں مبتلا ہے، وہ کبھی خود پسندی و خود پرستی کے مرض کا شکار نہیں ہوسکتا۔ اپنے گناہوں اور قصوروں پر کسی کی نگاہ ہو تو استغفار سے اس کو اتنی فرصت ہی نہ ملے کہ استکبار کی ہوا اس کے سر میں سما سکے۔

اس غلط رجحان کو روکنے والی ایک اور چیز یہ ہے کہ آدمی صرف ان پستیوں کی طرف نہ دیکھے، جن سے وہ اپنے آپ کو بلند پاتا ہے۔ بلکہ دین و اخلاق کی ان بلندیوں کو بھی دیکھے، جن کے مقابلے میں وہ ابھی بہت پست ہے۔ اخلاق و رُوحانیت کی پستیاں بھی لامتناہی ہیں اور بلندیاں بھی لامتناہی۔ برے سے برا آدمی بھی نیچے کی طرف دیکھے تو کسی اور کو اپنے سے بدتر پا کر اپنی برتری پر فخر کرسکتا ہے مگر اس فخر کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی موجودہ حالت پر مطمئن ہو کر بہتر بننے کی کوشش چھوڑ دیتا ہے بلکہ اس سے گزر کر نفس کی شیطنیت اسے یہ اطمینان بھی دلاتی ہے کہ کچھ اور زیادہ نیچے اتر جانے کی بھی ابھی گنجائش ہے۔ یہ نقطۂ نظر صرف وہی لوگ اختیار کرسکتے ہیں، جو اپنی ترقی کے دشمن ہوں۔ ترقی کی سچی طلب رکھنے والے ہمیشہ نیچے دیکھنے کی بہ جائے اوپر دیکھتے ہیں۔ ہر بلندی پر پہنچ کر مزید بلندیاں ان کے سامنے آتی ہیں، جنھیں دیکھ کر فخر کے بہ جائے اپنی پستی کا احساس ان کے دل میں خلش پیدا کرتا ہے اور یہی خلش انھیں اور زیادہ اوپر چڑھنے پر آمادہ کرتی ہے۔

ان سب چیزوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جماعت ہر وقت اس معاملے میں چوکنّی رہے۔ اور اپنے دائرے میں کبر اور تعلّی اور فخر و غرور کے ہر ظہور کا نوٹس لے کر بروقت اس کا تدارک کرے۔ مگر تدارک کی یہ کوشش کبھی ایسے طریقوں سے نہ ہونی چاہیے کہ لوگوں میں بناوٹی انکسار اور نمائشی تواضع کی بیماری پیدا ہو جائے۔ کبر کی اس سے بدتر کوئی قسم نہیں، جس پر تصنّع کے ساتھ عجز و انکسار کا پردہ ڈالا گیا ہو۔

نمود و نمائش

دوسرا بڑا عیب، جو خیر کی جڑوں کو کھا جانے میں کبر سے کسی طرح کم نہیں، یہ ہے کہ کوئی شخص بھلائی کا کام نمود و نمائش کے لیے کرے اور اس کام میں اسے خلق کی تحسین حاصل کرنے کی فکر یا اس کی پروا ہو۔ یہ چیز صرف خلوص ہی کی نہیں حقیقت میں ایمان کی بھی ضد ہے۔ اور اسی بنا پر اسے چھپا ہوا شرک قرار دیا گیا ہے۔ خدا اور آخرت پر ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان صرف خدا کی رضا کے لیے کام کرے۔ اسی سے اجر کی آس لگائے اور دنیا کے بہ جائے آخرت کے نتائج پر نگاہ رکھے، لیکن ریاکار انسان خلق کی رضا کو مقصود بناتا ہے۔ خلق ہی کے اجر کا طالب ہوتا ہے اور دنیا ہی میں اپنا اجر نام و نمود، شہرت، ہر دل عزیزی، نفوذ و اثر اور حشمت و جاہ کی شکل میں پا لینا چاہتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے خلقِ خدا کو شریک بنایا، یا اس کو مدِ مقابل

بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں آدمی خدا کے دین کی خواہ کتنی اور کیسی ہی خدمت کرے۔ بہ ہر حال وہ نہ خدا کے لیے ہوگی، نہ اس کے دین کی خاطر ہوگی اور نہ اس کا شمار خدا کے ہاں نیکوں میں ہوگا۔

صرف یہی نہیں کہ یہ ناپاک جذبہ نتیجے کے اعتبار سے عمل کو ضائع کر دیتا ہے، بلکہ درحقیقت اس کے ساتھ کوئی صحیح عمل کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس جذبے کی فطری خاصیت یہ ہے کہ آدمی کو اس کام سے زیادہ کام کے اشتہار کی فکر ہوتی ہے اور اسی کو وہ کام سمجھتا ہے، جس کا ڈھنڈورہ دنیا میں پٹے اور تحسین و آفرین کا خراج وصول کر کے لائے۔ خاموش کام جس کا خدا کے سوا کسی کو پتہ نہ ہو، اس کے نزدیک کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس طرح آدمی کے عمل کا دائرہ صرف قابلِ اشتہار اعمال تک محدود ہو جاتا ہے اور اشتہار کا مقصود حاصل ہو جانے کے بعد خود ان کے اعمال کے ساتھ بھی اسے کوئی دل چسپی باقی نہیں رہتی۔ آغاز کار میں خواہ کتنے ہی خلوص کے ساتھ عملی زندگی کی ابتدا کی گئی ہو یہ بیماری لگتے ہی خلوص اس طرح غائب ہونا شروع ہو جاتا ہے، جیسے دق کی بیماری آدمی کی قوتِ حیات کو کھاتی چلی جاتی ہے۔ پھر اس کے لیے یہ ممکن نہیں رہتا کہ منظرِ عام سے ہٹ کر بھی نیک رہے اور اپنا فرض سمجھ کر بھی کوئی فرض بجالائے۔ وہ ہر چیز کو اس کی نمائشی قدر اور تحسینِ خلق کی قیمت کے لحاظ سے جانچتا ہے۔ ہر معاملے میں صرف یہ دیکھتا ہے کہ دنیا کس روش کو پسند کرتی ہے اور کسی ایسے کام کا تصوّر کرنا بھی اس کے لیے ناممکن ہوتا ہے، جو دنیا میں اسے غیر مقبول بنا دے۔ خواہ ایمان داری کے ساتھ اس کے ضمیر کی آواز یہی ہو کہ وہ ہے کرنے کا کام۔ گوشوں میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے والوں کے لیے اس فتنے سے بچنا نسبتاً بہت آسان ہے۔ مگر جو لوگ پبلک میں آکر اصلاح اور خدمت اور تعمیر کے کام کریں، وہ ہر وقت اس خطرے میں مبتلا رہتے ہیں کہ نہ معلوم کب اس اخلاقی دق کے جراثیم ان کے اندر نفوذ کر جائیں۔ انھیں بہ ہر حال بہت سے وہ کام کرنے ہوتے ہیں، جو منظرِ عام پر آتے ہیں، انھیں عوام الناس کو اپنا ہم نوا بنانے اور ان کے اندر نفوذ حاصل کرنے کی کوشش کرنی ہوتی ہے۔ ان کے کام کی بہت سی ضروریات اس بات پر بھی مجبور کرتی ہیں کہ وہ اپنے کاموں کی رُودادیں شائع کریں۔ ان کی کچھ نہ کچھ خدمات ایسی بھی ہوتی ہیں، جو ان کی طرف خلق کا رجوع بڑھاتی اور زبانوں سے ان کے لیے تحسین کے کلمات نکلواتی ہیں۔ انھیں مخالفتوں سے بھی سابقہ پیش آتا ہے اور اپنی مخالفت میں بادلِ ناخواستہ ہی سہی، انھیں مجبوراً اپنے اچھے پہلوؤں کو نمایاں کرنا پڑتا ہے۔ ان حالات میں

یہ کوئی آسان کام نہیں ہے کہ شہرت ہو، مگر شہرت کی چاٹ نہ لگے۔ نمود و نمائش ہو مگر نمود و نمائش کی خاطر کام کرنے کی بیماری نہ لگے۔ مقبولیت ہو مگر وہ مقصود نہ بننے پائے، تحسینِ خلق ہو مگر اس کے حصول کی فکر یا اس کی پروا نہ ہو، ریا کی پیدائش کے اسباب چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوں مگر ریا سے دامن بچا رہے۔ اس کے لیے بڑی کاوش بڑی توجہ اور بڑی محنت کی ضرورت ہے۔ ایک ذرا سا تساہل بھی اس معاملے میں ریا کاری کے جراثیم کو گھس آنے کا راستہ دے سکتا ہے۔

اس سے بچنے کے لیے انفرادی کوشش بھی ہونی چاہیے اور اجتماعی کوشش بھی۔ انفرادی کوشش کا طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص کچھ نہ کچھ ایسے نیک اعمال کا التزام کرے، جو زیادہ سے زیادہ اخفا کے ساتھ ہوں اور ہمیشہ اپنے نفس کا جائزہ لے کر دیکھتا رہے کہ اسے زیادہ دل چسپی ان مخفی نیکیوں میں محسوس ہوتی ہے یا ان نیکیوں میں جو منظرِ عام پر آنے والی ہوں۔ اگر دوسری صورت ہو تو آدمی کو فوراً خبردار ہو جانا چاہیے کہ ریا اس کے اندر نفوذ کر رہا ہے اور اللہ سے پناہ مانگتے ہوئے پوری قوتِ ارادی کے ساتھ نفس کی اس کیفیت کو فوری بدلنے کی سعی کرنی چاہیے۔

اجتماعی کوشش کی صورت یہ ہے کہ جماعت اپنے دائرے میں ریاکارانہ رُجحانات کو کبھی نہ پنپنے دے۔ اپنے کاموں میں اظہار و اعلان کو بس حقیقی ضرورت تک محدود رکھے۔ شوقِ نمائش کا ادنیٰ سا اثر بھی جہاں محسوس ہو فوراً اس کا سدِ باب کرے، جماعتی مشوروں میں یہ بات کبھی اشارتاً و کنایتاً بھی برداشت نہ کی جائے کہ فلاں کام اس لیے کرنا چاہیے کہ وہ مقبولیت کا ذریعہ ہے اور فلاں کام اس لیے نہ کرنا چاہیے کہ لوگ اسے پسند نہیں کرتے۔ جماعت کا داخلی ماحول ایسا ہونا چاہیے کہ وہ لوگوں کی تعریف اور مذمت ہر دو سے بے نیاز ہو کر کام کرنے کی ذہنیت پیدا کرے۔ اور اس کی ذہنیت کی پرورش نہ کرے، جو مذمت سے دل شکستہ ہو اور تعریف سے غذا پائے۔ اس کے باوجود اگر کچھ افراد جماعت میں ایسے پائے جائیں، جن میں ریا کی بو محسوس ہو تو ان کی ہمت افزائی کرنے کے بہ جائے ان کے علاج کی فکر کرنی چاہیے۔

نیت کا کھوٹ

تیسرا بنیادی عیب نیت کا کھوٹ ہے، جس پر کسی خیر کی عمارت قائم نہیں ہو سکتی۔ خیر کا کام صرف اس خالص نیت ہی سے ہو سکتا ہے کہ دنیا میں بھلائی پھیلے اور ہم اس کے لیے سعی کر کے اللہ کے ہاں سُرخ رو ہوں۔ اس نیت کے ساتھ اپنی کوئی ذاتی یا گروہی غرض شامل نہ ہونی چاہیے۔ اپنا کوئی دنیوی مفاد پیش نظر نہ ہونا چاہیے حتیٰ کہ کسی تاویل کے ساتھ بھی اس مقصدِ خیر کے ساتھ

اپنے اپنے کسی منفعت کی طلب یا امید کی لاگ لگی نہ رہنی چاہیے۔ ایسا ہر لوث نہ صرف یہ کہ اللہ کے ہاں آدمی کے اجر کو ضائع کر دے گا بلکہ دنیا میں بھی اس آلودگی کو لیے ہوئے کوئی صحیح کام نہ ہو سکے گا۔ نیت کی خرابی لامحالہ کردار پر انداز ہوگی اور کردار کی خرابی کے ساتھ اس جدوجہد میں کامیاب ہونا ممکن نہیں ہے، جس کا اصل مقصود برائی کو مٹا کر بھلائی کو قائم کرنا ہے۔ یہاں پھر وہی مشکل پیش آتی ہے، جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ جزوی بھلائیوں کے لیے کام کرنے کی صورت میں نیت کو اس کھوٹ سے پاک رکھنا کچھ زیادہ دشوار نہیں ہے۔ تھوڑا سا تعلق باللہ اور جذبۂ صادق بھی اس کے لیے کافی ہو سکتا ہے مگر جن لوگوں کے پیشِ نظر یہ ہو کہ ایک پورے ملک کے نظامِ زندگی کی اصلاح کی جائے اور اسے بہ حیثیتِ مجموعی ان بنیادوں پر استوار کیا جائے، جو اسلام نے ہمیں دی ہیں وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے صرف تعمیرِ افکار یا صرف تبلیغ و تلقین، یا صرف اصلاحِ اخلاق کی کوششوں پر اکتفا نہیں کر سکتے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انھیں لامحالہ ملک کے سیاسی نظام کا رُخ بھی اپنے مقصد کی طرف موڑنے کے لیے بالواسطہ یا بلاواسطہ جدوجہد کرنی پڑتی ہے تاکہ اقتدار یا تو بہ راہِ راست ان کے ہاتھ میں آئے یا کسی ایسے گروہ کی طرف منتقل ہو، جسے ان کی تائید اور پشت پناہی حاصل ہو۔ دونوں صورتوں میں سے خواہ کوئی بھی صورت ہو۔ اقتدار کا تصوّر سیاسی نظام کی تبدیلی سے منفک نہیں ہو سکتا۔ اب تو قعرِ دریا میں رہ کر دامن تر نہ ہونے دینے کا معاملہ ہے کہ ایک جماعت یہ کام کرے اور پورے انہماک کے ساتھ کرے اور پھر بھی اس کے افراد کی انفرادی نیتوں اور پوری جماعت کی مجموعی نیت کو، اپنے لیے اقتدار کی طلب کا لوث نہ لگنے پائے۔ یہ چیز بڑا مجاہدہ نفس اور بڑا تزکیہ قلب و روح چاہتی ہے۔

اس معاملے میں صحیح نقطۂ نظر پیدا کرنے کے لیے دو بہ ظاہر متماثل چیزوں کا جوہری فرق اچھی طرح ذہن نشین ہونا چاہیے۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ مجموعی نظامِ زندگی کی تبدیلی چاہنے والا دوسری تبدیلیوں کے ساتھ سیاسی نظام کی تبدیلی آپ سے آپ اس امر کی مقتضی ہے کہ اقتدار ان لوگوں کی طرف یا ان کی پسند کے لوگوں کی طرف منتقل ہو، جو اس تبدیلی کے خواہش مند ہوں۔ مگر فرق اور بہت بڑا فرق ہے ''اپنے لیے'' اقتدار چاہنے اور اپنے اصول اور نصب العین کے لیے اقتدار چاہنے میں۔ اصول کا اقتدار چاہے عملاً اصول کے علم برداروں ہی کا اقتدار ہو۔ پھر بھی

''اصول کا اقتدار'' چاہنا اور اس کے علم برداروں کا ''اپنے لیے اقتدار'' چاہنا۔ حقیقتاً دو الگ الگ چیزیں ہیں، جن میں رُوح اور جوہر کا بہت بڑا فرق ہے۔ نیت کا کھوٹ، دوسری چیز میں ہے، نہ کہ پہلی چیز میں اور مجاہدۂ نفس جس چیز پر مرکوز ہونا چاہیے، وہ یہ ہے کہ پہلی چیز کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دینے پر بھی دوسری چیز کا ذہن میں شائبہ تک نہ آنے پائے۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کا نمونہ ہمارے سامنے ہے۔ انھوں نے مجموعی نظامِ زندگی کو بدل کر اسلام کے اصولوں پر قائم کرنے کی جدّوجہد کی۔ یہ چیز سیاسی غلبہ واقتدار کی بھی متقاضی تھی کیوں کہ دین کو پوری طرح غالب کر دینا اس کے بغیر ممکن نہ تھا اور عملاً اس جدوجہد کے نتیجے میں اقتدار ان کے ہاتھ میں آیا بھی لیکن اس کے باوجود کوئی ایمان دار آدمی یہ شبہ تک نہیں کر سکتا کہ ان کی جدوجہد کا مقصود ''اپنا اقتدار'' تھا۔ دوسری طرف اپنے اقتدار کے طالبوں سے تاریخ بھری پڑی ہے اور تاریخ میں ان کو ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے وہ دنیا میں موجود ہیں۔ عملاً اقتدار پانے کو اگر ایک واقعہ کی حیثیت سے لیا جائے تو دونوں گروہوں میں کوئی فرق نہیں لیکن نیت کے لحاظ سے دونوں میں عظیم الشان فرق ہے۔ اس فرق پر دونوں کا کردار، جدوجہد کے دور کا کردار بھی اور کام یابی کے دور کا کردار بھی ناقابلِ انکار شہادت دے رہا ہے۔ جو لوگ صدقِ دل سے اصولِ اسلام کے مطابق زندگی کا ہمہ گیر اقتدار چاہتے ہوں انھیں فرداً فرداً بھی اس فرق کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اپنی نیت درست رکھنی چاہیے اور ان کی جماعت کو مجموعی طور پر اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ ''اپنا اقتدار چاہنے'' کی نیت کسی شکل میں بھی اس کے دائرے میں جگہ نہ پا سکے۔